ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

ندوۃ العلماء کا مسلک اعتدال

(۱)

شعور کی آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ والد صاحب میلاد خواں اور فاتحہ خواں ہیں، تعزیہ دار ہیں، شب براءت، محرم، گیارہویں، بارہویں کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ کسی کی موت پر تیجا یا چہارم، چالیسواں اور برسی کرتے ہیں۔ بس یہی دین ہے۔ دہریت تو خواب میں نہ تھی، مگر مذہبیت یہی تھی۔ برٹش دور تھا، سرکاری اسکول کی تعلیم ہوئی جہاں اردو ثقافت کا غلبہ تھا۔ جب میلاد کی کتابیں پڑھ لینے لگا اور والد صاحب کو محسوس ہوا کہ میں ان سے زیادہ علم رکھتا ہوں تو مجھے اپنا نائب بنا دیا۔ ابھی تک میری ملاقات کسی عالم دین سے نہ ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ مذہب کا کام عقلی طور پر جو باتیں بری ہیں، ان سے دور رکھنا اور جو اچھی ہیں، ان پر عمل کرانا ہے۔ ابھی تک شرک وتوحید کی بات میرے ذہن میں نہ آئی تھی۔ میں ہندوؤں کے بھجن میں لطف لیتا، قوالی بالمزامیر میں لذت پاتا، جمعہ جمعہ نماز پڑھ لیتا، نفل روزوں کا اہتمام کرتا اور بڑا دیندار سمجھا جاتا، اپنے رشتہ داروں میں بڑی عزت پاتا۔

میری اردو بہت اچھی ہوگئی، کچھ فارسی بھی آ گئی۔ بعض عزیزوں نے مجھے جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصنیف ''رسالہ دینیات'' اور ''خطبات'' پڑھنے کا مشورہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ یہیں سے میری زندگی میں انقلاب شروع ہوا۔ اب میں نے دین کو سمجھنے کی کوشش شروع کی تو اختلافات کی دنیا میں الجھ کر رہ گیا۔ اب جی چاہا کہ کسی عالم سے ملوں، لیکن طے کیا کہ ملنے کے بجائے پہلے اس کی تقریر سنوں، اس لیے کہ ملنے پر وہ اپنے علم سے مجھے دبا لے گا اور تقریر سن کر میں کوئی رائے قائم کرنے میں آزاد رہوں گا۔ میرے آباواجداد کے گاؤں گرونڈہ ضلع بارہ بنکی میں مولانا حشمت علی صاحب کی تقریر ہوا کرتی تھی۔ میں نے پہلی بار جو کسی عالم کی تقریر سنی تو وہ مولانا حشمت علی صاحب کی تقریر تھی۔ میں نے ان کی تین تقریریں سنیں تو مجھے جیسے کسی عالم کی تقریر سننے سے تنفر پیدا ہو گیا اور دل میں شک وشبہات آنے لگے۔ خیال ہوا جو سمجھ میں آئے، اس پر عمل کرو اور مولویوں کے چکر میں مت پڑو کہ فلاں کو کافر کہو، فلاں کو کافر کہو۔ سوچا کہ جن کے نام میں نے مولانا حشمت علی صاحب کی زبان سے پہلی بار سنے، ان سے بالکل ناواقف ہوں تو ان کو ان کے کہنے سے کافر کیوں کہوں؟

کافی دنوں تک اسی کشمکش میں رہا کہ اب ایک اور عالم کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ تھے حضرت مولانا محمد عبد

الشکور فاروقی۔ یہ واقعہ ۱۹۵۳ء کا ہے۔ اب تو میری دنیا یکسر بدل گئی۔ ساری بدعتیں ترک ہوئیں، پنج وقتہ نماز کا اہتمام ہوا، حتی الامکان سنتوں پر عمل ہوا۔ مدرسہ ابو محمد یہ علی آباد میں مدرسی اختیار کر لی۔ وہیں کے ایک جلسہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی تقریریں سنیں اور ان سے تعلقات ہو گئے۔ تبلیغی جماعت سے تعلق ہوا، تب تبلیغ میں نکلنا ہونے لگا۔ پھر ان دونوں مذکورہ بزرگوں سے تعلق کے سبب ندوہ آ گیا۔ مکتب میں تدریس کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہاں یونیورسٹی کی لائن میں علمی ترقی بھی کرتا رہا اور منصبی بھی۔ میں نے یہاں دیکھا کہ حنفی بھی پڑھتے ہیں اور شافعی بھی۔ خانقاہی بھی پڑھتے ہیں اور اہل حدیث بھی۔ اساتذہ میں بھی ان چاروں مسلک کے لوگ ہیں اور شوریٰ میں بھی۔ کسی کی تقریر میں، کسی کی تحریر میں یہاں اختلافات کا ذکر آتا ہی نہیں ہے۔ یہاں رفع یدین بھی ہوتا ہے اور اس کا ترک بھی، آمین بالجہر بھی ہے اور بالسر بھی، امام کے پیچھے الفاتحہ کی قراءت بھی ہے اور امام کی قراءت پر اکتفا بھی، بیس رکعات تراویح پڑھنے والے بھی ہیں اور آٹھ رکعت پڑھ کر چلے جانے والے بھی۔ نہ کوئی کسی پر نکیر کرتا ہے نہ تنقیص، بلکہ باہم ایک دوسرے کا احترام ہے۔ مجھے یہ فضا بہت ہی اچھی لگی۔ یہاں کا اعتدال مجھے بھا گیا۔

اب تک میرا علم دین ترجموں سے تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں عربی سیکھوں اور دین کو براہ راست پڑھوں۔ اپنے طور پر حفظ تو کر لیا تھا۔ عربی بھی شروع کی مگر گاڑی چل نہ سکی۔ دعاؤں کا اہتمام کیا، سمع الله لمن حمده، میرے رب نے کس طرح سنی اور کس طرح اس کی شکلیں پیدا ہوئیں، یہ میرے اور میرے رب کے بیچ ایک راز ہے۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ ریاض یونیورسٹی سے وظیفہ ملا، وہیں عربی سیکھی، وہیں کنڈس کورس کر کے تفسیر و حدیث میں تخصص کے ساتھ کلیۃ التربیۃ سے ماجستیر کیا۔ سات سال ریاض میں رہا، دوران تعلیم امامت بھی کی اور قرآن مجید کی تدریس کا کام بھی۔ اب میرے دماغ پر حضرت مولانا علی میاں صاحب، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے ساتھ علامہ ابن تیمیہ کا بھی تسلط ہوا۔ قیام ریاض کے دوران چوٹی کے وہابیوں کی جماعت میں اس حیثیت سے شامل رہا کہ میں عامل بالقرآن والحدیث ہوں۔ بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مقلد ہوں اور تقلید کو صحیح سمجھتا ہوں۔ میں اس جماعت میں رہا جس کی رپورٹ پر اچھے اچھے منصب والوں کے پاسپورٹ پر خروج لگ جایا کرتا تھا۔

۱۹۸۵ میں، میں ایم اے کر کے واپس آیا اور پھر ندوۃ العلماء سے منسلک ہو گیا۔ اب مجھے یہاں بڑا سکون ملا۔ ذاتی طور پر اتحاد بین المسلمین کو مشن بنایا۔ تحریر و تقریر سے میدان عمل میں آیا، کسی حد تک کامیاب ہوا۔ محنت جاری ہے۔ رد قادیانیت میں عملی میدان میں ہوں اور اہل بدعت کو حکمت سے سنت پر لانے میں بھی کوشاں ہوں۔ یہ سارے کام اپنے فاضل اوقات میں کچھ معاونین کے ساتھ کرتا ہوں۔ یہاں کی انتظامیہ کا تعاون بھی حاصل ہے یعنی اجازت و ترغیب۔ ساتھ ہی ندوۃ العلماء کے عطا کردہ فرائض منصبی کی ادائیگی کی بھی بھرپور توفیق ملتی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلک۔

ادھر کئی سالوں سے عازمین حج کی روانگی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں حج میلہ لگ جاتا ہے۔ اس سال اس حج میلہ میں ایک مکتبہ پر ایک کتاب نظر آئی جس میں لکھا ہوا تھا کہ تقلید شرک ہے اور مقلد

مشرک ہے۔ یہ پڑھ کر سخت دھچکا لگا۔ ظاہر ہے لکھنے والے صاحب سلفی العقیدہ ہیں، لیکن ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم اور اساتذہ، ندوۃ العلماء کے ناظم اور یہاں کے ۹۸ فیصد طلبہ سب مقلد ہیں۔ یہ بات ہم لوگوں کے لیے سخت اذیت کا باعث ہے۔

الحمد للہ یہاں تقلید کے یہ معنی نہیں لیے جاتے کہ مقلِّد، مقلَّد کے ایجاد کردہ مذہب کا مقلد ہے بلکہ وہ کتاب وسنت کی تفہیم میں اس کا مقلد ہے یعنی اسے استاد سمجھتا ہے۔ آج سلفیوں میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور اہل حدیث حضرات ان میں سے جسے ترجیح دیتے ہیں، اس کی رائے پر یعنی اس کی تفہیم پر عمل کرتے ہیں۔ شیخ ناصر الدین البانی سلفی حضرات کے چوٹی کے عالم ہیں۔ انھوں نے عورت کے لیے انگوٹھی کے علاوہ سونے کے زیور کے استعمال پر نکیر کی ہے، چہرہ کے پردہ کی مخالفت کی ہے اور جہری نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے منع کیا ہے۔ کوئی سلفی ان کی رائے سے اتفاق کر کے اس پر عمل کرتا ہے تو کوئی دوسرے سلفی عالم کے مسلک کو اپناتا ہے۔ اسی طرح یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتاب وسنت کی تفہیم میں کوئی احناف کے مسلک پر ہے تو کوئی مالکیہ کے مسلک پر، کوئی شافعی ہے تو کوئی حنبلی اور کوئی اہل حدیث کے مسلک پر ہے۔ الحمد للہ ہم سب منشرح ہیں کہ ہم سب حق پر ہیں، ناحق افتراق واختلاف کی بات ہم سب کو ناپسند ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

(بشکریہ پندرہ روزہ 'تعمیر حیات'، لکھنو)

(۲)

اجتہادی اختلافات میں معاشرتی مصالح کی رعایت

مولانا سید سلمان الحسینی الندوی

شادی خانہ آبادی کے لیے کی جاتی ہے، خانہ خرابی یا محض عیاشی اور لذت کوشی کے لیے نہیں، اس لیے بغیر کسی وجہ شرعی کے طلاق دینا فعل حرام ہے۔ طلاق صرف اس وقت دینا چاہیے جب ساتھ رہنا دوبھر ہو جائے اور طلاق نہ دینے میں خطرات اور فتنہ کا اندیشہ ہو۔ اس صورت حال کے لیے طلاق جیسی ناپسندیدہ چیز کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن پاکی کی حالت میں صرف ایک طلاق دے دینا چاہیے اور پھر عدت گزر جانے دینا چاہیے۔ طلاق غصہ میں، اشتعال میں اور جذبات میں نہیں دینا چاہیے، غصہ پر قابو پانا چاہیے اور ہر حال میں تعلقات کو خوش گوار رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

تین طلاقیں ایک وقت میں ہرگز نہ دینا چاہیے۔ تین طلاقیں اگر ایک مجلس میں دے دی گئیں تو وہ ایک شمار ہوتی ہے یا تین ہی، ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض احادیث اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کی روشنی میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کو چاروں ائمہ نے تین طلاق ہی قرار دیا ہے، جن کے بعد حق رجوع نہیں رہتا۔ لیکن اصلاً بہت سے مردوں کی طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں غیر محتاط روش کی بنیاد پر تین طلاقوں کو نافذ کر کے ان کو سزا دینا مقصود تھا۔ اس معاشرہ میں بیوہ کی شادی کوئی دشوار مسئلہ نہ تھی، نہ لڑکی والوں کو کچھ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس فیصلہ کے نفاذ میں جو حضور ﷺ نے بھی بحیثیت امیر اور حضرت عمرؓ نے بھی بحیثیت خلیفۃ المسلمین فرمایا تھا، مرد کے لیے ایک طرح کی تعزیر (قانونی سزا) تھی۔ دوسری طرف آج مرد کے طلاق ثلاثہ کے گناہ کا زیادہ تر بھگتان عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔ عورت جہیز لاتی ہے، گھر بسانے کا ذریعہ بنتی ہے، تقریب نکاح کے موقع پر اس کے یہاں ولیمہ کی طرح دعوت ہوتی ہے، مرد سب کچھ حاصل کرتا ہے، مہر بھی معاف کرا لیتا ہے، ایک ولیمہ پر لذت کوشی کرتا ہے، پھر غصہ اور اشتعال میں تین طلاق دے کر الگ ہو جاتا ہے، دوسری شادی رچا لیتا ہے۔ عورت بیوہ ہو جاتی ہے۔ شادی کی نہ خود ہمت کرتی ہے نہ معاشرہ اس کی شادی کا فوری انتظام کرتا ہے اور اگر اس کے بچے ہیں تو شادی کا مسئلہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔ دین کے بارے میں جزئی حل پیش کرنے والے مفتی فتویٰ دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ مطلقہ عورت عمر بھر کڑھتی اور اپنے جائز تقاضوں کو دبا کر زندگی گزارتی ہے۔ دین وعفت کی مضبوط حصار ہے تو سینہ میں غم اور کسک لے کر جیتی ہے، ورنہ دین وعفت سے معافی مانگ لیتی ہے۔

ایسی شکل میں علما اور اہل افتا وقضا کو سوچنا چاہیے کہ عرف، عموم بلویٰ، ضرورت، اضطرار، حاجت، رفع حرج، تیسیر، رخصت کی ترازو میں تول کر اس کا مسئلہ حل کریں اور ایک نزاعی مسئلہ جس میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے درمیان اور بعد کے علماے امت کے درمیان اختلاف رہا ہے اور جو کفر وایمان کا مسئلہ نہیں ہے، ایک پہلو ہی پر شدت کا مظاہرہ نہ کریں۔

دوسری طرف بعض احادیث اور صحابہ کرام، تابعین عظام اور علماے امت کے اقوال ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق مانتے ہیں۔ یہ بھی ایک رائے ہے۔ اہل حدیث حضرات آج اس کے پرزور نمائندہ بنے ہوئے ہیں۔ اس میں حرج نہیں کہ علمی اختلاف رکھنے والے اپنے اختلاف کو علمی حدود میں علم کی میز پر بیان کریں، لیکن کسی اختلافی مسئلہ کو امت میں تفریق اور گروہ بندی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

حضرت عمرؓ نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین ایک فیصلہ فرمایا تو مسلمانوں نے ان سے اتفاق کیا۔ جس کو اختلاف بھی ہوا، اس نے اپنے اختلاف کو اپنے تک محدود رکھا۔ آج ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو ایک وقعت، وقار اور اعتبار حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا ایک مظہر اور ان کی اعتباری قوت حاکمہ کا نمائندہ ہے۔ اگر ایک اختلافی مسئلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، ارکان، علما کی اکثریت کی آرا کی بنیاد پر ایک فیصلہ کرتے ہیں تو مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی بقا اور ان کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں اس رائے کا ساتھ دینا ہے۔ ہاں انفرادی طور پر اور خاص

واقعات میں ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ عوام کے لیے اور خاص طور پر عورتوں کے طبقہ کے لیے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں کو ملحوظ رکھا جائے اور ایسے معاملات میں اگر کوئی مفتی خود فیصلہ نہیں کر پاتا تو اہل حدیث علما سے رجوع کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

(۳)

کیا شیعہ سنی اتحاد ممکن ہے؟

ڈاکٹر سید منظر تمنائی

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع حضرات کا تنازع ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ چونکہ یہ فرقے بنیادی طور پر اختلاف رکھتے ہیں، اس لیے ان کا مذہبی اعتبار سے یکجا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ملکی اور ملی اعتبار سے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر ایک مرکز پر آ جائیں اور مطلب برآری کے لیے یکجا ہو کر حصول مقصد کو اولین حیثیت دیں اور شیر وشکر ہو کر اپنے اپنے مقاصد پورے کرتے رہیں، لیکن مذہبی اعتبار سے ان کا ایک ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔ اگر دونوں فریق باہم یہ طے کر لیں کہ ہمیں بہر صورت اتفاق رائے سے ایک ہو جانا ہے تو کوئی نظریہ، کوئی خیال اور کوئی عقیدہ مانع نہیں رہتا کہ درمیان میں کسی قسم کی رسہ کشی کی گنجایش باقی رہے، مگر بنیاد سے ہٹ کر ایک مرکز پر آنا نہ صرف دشوار ترین مرحلہ ہے بلکہ بادی النظر میں ناممکن نظر آتا ہے۔ بنظر غائر مطالعہ کے بعد یہ بات انتہائی واضح نظر آتی ہے کہ بنیاد سے ہٹ کر معاملہ فہمی ممکن نہیں ہے، کیونکہ بنیاد ہی میں جب فرق ہوگا تو دونوں فریق اپنی بنیادی حیثیت کو کبھی ختم کرنے پر تیار نہ ہوں گے۔ بنیادی طور پر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کون سی شے ہے جو ہمیں اسلام میں داخل کر کے مسلمان بناتی ہے۔ یہ چیز ''کلمہ طیبہ'' ہے۔ اس پہلے کلمہ میں ہی فرق ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

سنی کلمہ یہ ہے: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء ورسل کا کلمہ دو باتوں یعنی توحید ورسالت پر مشتمل تھا۔ صحابہ کرام واہل بیت عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور پوری امت مسلمہ کا بھی یہی کلمہ ہے۔ الحمد للہ آج بھی مسلمانوں کی مساجد، کتابوں اور زبانوں پر اسی مبارک کلمہ کی گونج ہے اور پاکستان بھی اسی کلمے کے نعرے پر حاصل کیا گیا تھا۔ شیعہ حضرات نے کلمہ طیبہ میں توحید ورسالت کے ساتھ تیسرا جزو، ولایت شامل کر کے اپنے لیے الگ کلمہ بنا لیا ہے۔ اس طرح انھوں نے خود کو امت مسلمہ سے جدا بھی کر لیا ہے، کیونکہ وحدت ملت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مبارک کلمہ ہے۔ شیعہ حضرات نے بھٹو

دور میں لڑ جھگڑ کر اپنے لیے علیحدہ نصاب دینیات منظور کرایا تھا جس کے لیے مستقل کتاب طبع کروائی گئی۔ اس میں جو کلمہ درج ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ و خلیفتہ بلا فصل

(رہنمائے اساتذہ، اسلامیات برائے نہم ودہم، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء)

ایرانی انقلاب نے شہنشاہ ایران سے عنان حکومت لے کر حضرت خمینی کے دست مبارک میں دی تو کلمہ اس طرح بنایا گیا:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ خمینی حجۃ اللہ

بات صرف یہاں تک نہیں رہی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کلمہ شہادت میں بھی اضافہ کر لیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ وعلی ولی اللہ واشہد ان خمینی روح اللہ حجۃ اللہ علی خلقہ (ماہنامہ وحدت اسلامی، جون ۱۹۸۴ء)

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہ اہل سنت اور اہل تشیع حضرات ایک ہو جائیں گے، بظاہر ناممکن نظر آتی ہے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں گروہ با اختیار ہو کر ایک جگہ بیٹھیں اور خلوص دل اور خلوص نیت کے ساتھ کھلے دل سے طے کر لیں کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ پھر دونوں حضرات غلط بات کو نہ صرف تسلیم کریں بلکہ بیک وقت ترک کر دیں اور باہم ایک ہو جائیں۔ پھر یہ ممکن ہے، کہ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا موقع میسر آئے گا اور نہ کوئی اعتراض کی جرات کرے گا۔

ڈاکٹر سید منظر تمنائی

15-A/I، بفرزون، نارتھ کراچی

(۴)

''شیعو اور سنیو!'' کے بارے میں گزارشات

حافظ محمد قاسم

'الشریعہ' کے جنوری ۲۰۰۵ کے شمارے میں علامہ سید فخر الحسن کراروی کے مضمون بعنوان ''شیعو اور سنیو! تاریخ

سے سبق سیکھو!'' کے حوالے سے ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

کراروی صاحب! آپ نے مضمون کے آغاز میں شیعوں اور سنیوں کو ایک اللہ کو ماننے والے اور مومن ومسلم کہا ہے۔ جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ سے نہ صرف عقیدۂ توحید پر قائم ہیں بلکہ ختم نبوت بھی ان کے ایمان کا لازمی جزو ہے، لیکن آپ حضرات نے کلمہ توحید میں تبرا اور جھوٹ کو شامل کر لیا ہے اور اس کے ساتھ نظریہ امامت کو بھی اپنا رکھا ہے جو ختم نبوت کے منافی ہے۔ آپ تو اپنی عبادت گاہ کو بھی مسجد کہہ کر پکارنا نہیں چاہتے، بلکہ اسے 'امام بارگاہ' کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں 'اشداء علی الکفار رحماء بینھم' کہہ کر صحابہ کرام کی مدح وتوصیف کی گئی ہے، لیکن آپ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور ساتھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ ان اصحاب قدسی پر تبرا کرتے ہیں۔

آپ حضرات نے ہمیشہ اہل سنت کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور خلافت راشدہ کے زمانے سے طالبان کی امارت اسلامیہ تک ہمیشہ ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ خلفاے راشدینؓ کے زمانے میں مشہور یہودی عبداللہ بن سبا نے شیعیت کو پروان چڑھایا اور حضرت علیؓ کے زمانے میں مسلمانوں میں بغض وعناد پیدا کر کے انھیں آپس میں لڑایا۔ سانحہ کربلا میں کوفہ کے شیعوں نے حضرت حسین کو بلا کر شہید کروا دیا جس پر آپ آج تک ماتم کرتے ہیں۔ مصر میں جب فاطمیوں کی حکومت قائم ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر سرعام تبرا کیا گیا۔ عراق میں بنو عباس کی خلافت اسلامیہ کو ختم کرنے میں اہل تشیع کا کردار سب سے نمایاں تھا۔ بنو عباس کے آخری خلیفہ کے وزیر ابن علقمی شیعہ نے جس طرح ہلاکو خان کے ہاتھوں خلافت کا خاتمہ اور خلیفۃ المسلمین کو شہید کروایا، تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے۔ سلطان ٹیپوؒ کے دور میں سلطنت خداداد کے شیعہ وزیروں میر جعفر اور میر غلام علی نے انگریز کے ساتھ ساز باز کر کے سلطان کو شہید کروا دیا اور خود بڑی بڑی جاگیریں حاصل کر لیں۔

حالیہ تاریخ میں افغانستان میں ایران نے امارت اسلامیہ کے خلاف جنگ کی ابتدا کرنا چاہی، لیکن منہ کی کھانی پڑی۔ بامیان کے پہاڑ ایرانی اسلحہ کے گواہ ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہاں ایران کی طرف سے اسلام مخالف تدریسی نصاب تقسیم کیا گیا۔ اب عراق میں مقتدیٰ الصدر کہاں غائب ہو گیا ہے؟ لوگوں کو مروا کر اس نے خود ہتھیار کیوں ڈال دیے ہیں؟ اب بھی عراق کے سنی علاقوں میں مزاحمت جاری ہے، جبکہ آیت اللہ سیستانی امریکی فوجوں اور امریکی بندوقوں کے سائے تلے انتخابات کے حق میں دھڑا دھڑ شرعی فتوے جاری کرتے رہے۔

آپ نے کشمیر کے معاملے میں ایران کی حمایت کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ بھول گئے کہ شام، عراق اور اردن پر بھی شیعہ ہی حکمران ہیں اور لیبیا کا کرنل قذافی بھی نصیری شیعہ ہے۔ ان سب ملکوں نے کبھی پاکستان کی کشمیر پالیسی کی

حمایت نہیں کی۔ ایران کی حمایت بھی جھوٹی اور منہ دکھاوے کی ہے، ورنہ ساتھ ہی ساتھ بھارت کے ساتھ پیار کی پینگیں کیوں بڑھائی جاتی رہیں؟

اگر لاشوں کے تحفے ایران پہنچے ہیں تو آپ کو کیوں دکھ ہے؟ کیا آپ ایرانی ہیں یا ایران کی مدد سے پھل پھول رہے ہیں؟ یہ لاشیں ان کی اپنی کرتوتوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے ایران گئی ہیں۔ پاکستان میں جہاں بھی خانہ فرہنگ ایران ہے، وہ دہشت گردی کی پناہ گاہ ہے اور وہاں سے تبرا پر مبنی کتب چھاپی جاتی ہیں۔ شیعوں اور خصوصاً ایرانی حکومت کے مسلح غنڈوں نے ۸۴ء اور ۸۶ء میں کوئٹہ میں مسلمانوں کا جو قتل عام کیا اور پاک باز خواتین کی آبروریزی کی، اسی طرح کراچی میں جو ظلم ہوئے، وہ آپ کو نظر نہیں آئے؟

شیعوں خصوصاً ایرانی حکومت کی ذہنیت کا اندازہ پاکستان کے سابق کمانڈر انچیف مرزا اسلم بیگ کے ایک بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہفت روزہ 'زندگی' لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

> ''اپنا انقلاب (یعنی تشیعی حکومت) دوسرے ممالک میں برآمد کرنے کے ایرانی جذبے نے متعدد مسلم ممالک میں ایران کے متعلق ایک طرح کے مزاحمتی رویے کو جنم دیا ہے۔ میرے خیال میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج کے ایرانیوں میں بھی قبل از مسیح کی ایرانی سلطنت (پرشین ایمپائر) کا تصور موجود ہے۔ میرے دور میں ایران کے کمانڈر انچیف محسن رجائی پاکستان آئے تو ان کے پاس اس پرشین ایمپائر کے نقشے موجود تھے۔ وہ مجھے بتاتے رہے کہ ماضی میں پاکستان، کشمیر، افغانستان اور وسط ایشیا کے کون کون سے علاقے ایرانی سلطنت کا حصہ رہے ہیں۔ ایرانیوں کی یہ سوچ علاقائی تعاون کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ایرانی دعوے تو بہت کرتے ہیں، لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو وہ آگے نہیں بڑھتے۔ ہم نے دفاعی میدان میں پیش قدمی کی کوشش کی، لیکن خاص حد پر جا کر وہ رک گئے۔'' (ہفت روزہ زندگی، ۲۳ تا ۲۹ مئی ۱۹۹۲)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایران کے شیعہ حکمرانوں نے ابھی تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور ان کی طرف سے اس کو کمزور کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ مرزا اسلم بیگ صاحب کی یہ بات ۱۰ سال کے بعد بالکل سچ ثابت ہو گئی جب ایران نے بین الاقوامی ایٹمی توانائی کمیشن کے دباؤ پر پاکستان سے لی گئی ایٹمی امداد کے بارے میں تمام راز اگل دیے اور محسن پاکستان جناب ڈاکٹر عبد القدیر زیر عتاب آ گئے۔

حافظ محمد قاسم

دار العلوم ختم نبوت۔ بلاک ۱۲۔ چیچہ وطنی